بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پانچ دن کم بیس مہینے کی جبری غیر حاضری کے بعد میں اور میرے دونوں رفیق ۲۸ مئی سنہ ۵۰ء کو پھر اسی زندگی کی طرف واپس آ گئے جس سے ۴ اکتوبر سنہ ۴۸ء کو ہمیں خارج کیا گیا تھا۔ اس مدت میں جن وجوہ سے ہم قید رکھے گئے اور اس سے پہلے ہم کو قید کرنے کے لئے جس جس طرح زمین ہموار کی گئی تھی، اس کے متعلق اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ ساری باتیں ان صفحات میں بیان ہو چکی ہیں۔ اور ویسے بھی ترجمان القرآن کے ناظرین اس کے محتاج نہیں ہیں کہ انہیں اس معاملہ کچھ بتایا جائے، کیونکہ اس ملک میں ان سے زیادہ میرے جرم کا جاننے والا اور کوئی نہیں ہے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ پچھلے ۱۷-۱۸ سال سے میں کیا کچھ کرتا رہا ہوں۔ اسی طرح مولانا امین احسن صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کے جرائم بھی سب سے بڑھ کر انہی کے مشاہدے میں آتے رہے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہماری گرفتاری کی خبر پاتے ہی سارا معاملہ خود سمجھ لیا ہوگا۔ شاید ان میں سے کسی کو بھی پہلی مرتبہ یہ سن کر حیرت نہ ہوئی ہوگی کہ ہم پکڑے گئے، بلکہ اگر وہ کبھی حیران ہوئے ہوں گے تو اس بات پر کہ آخر شیطان اتنی مدت تک ہم جیسے قصورواروں کو برداشت کیسے کرتا رہا۔

اس موقع پر اپنی ذات کے متعلق میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی ۴۷ سال کی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سن کر، سوچ کر، سمجھ کر اور مشاہدہ و تجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے، میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں جن کی پشت پر برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے اور ان پر میں پورے علمی و روحانی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں۔ اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے اور ان کو

قلب و دماغ کے متفقہ فیصلہ کے ساتھ رد کرچکا ہوں۔ میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں رہے ہیں بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصب العین کی طرف کھینچا ہے جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا۔ اور ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی اس جدوجہد میں مبتلا کر دیا ہے جس میں مَیں خود مبتلا ہوں۔ اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی، ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفاخانہ امراضِ دماغی ہے۔ اور اگر اس نے یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آکر میں اپنا ضمیر اس کے ہاتھ رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راشن کٹتے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگونگا، تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دل صداقت کے لئے تو ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری ہر رائے کو علمی و عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے لیکن میرا ایمان و ضمیر کوئی قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے۔ اس کی کوشش پہلے بھی جس نے کی ہے ناکام ہوا ہے اور آئندہ بھی جو کرے گا انشاء اللہ منہ کی کھائے گا۔

ممکن ہے اس کارروائی کا فیصلہ کرتے وقت یہ مقصد بھی پیشِ نظر رہا ہو کہ اس طرح اُس کام کو روکا جائے جو میں اور میرے ساتھی کر رہے تھے۔ اگر میرا یہ قیاس درست ہے تو میں کہوں گا کہ اس مقصد کے لئے ہماری گرفتاری کا فیصلہ کرنے والے خود ایک غلط فہمی میں گرفتار تھے اور مجھے امید ہے کہ اب ان کی غلط فہمی دور ہوگئی ہوگی۔ انہوں نے شاید یہ سمجھا تھا کہ جماعت اسلامی چند مٹھی بھر سر پھروں کی ایک جماعت ہے جو اتفاقاً جمع ہوگئی ہے اور اس کا سارا کام بس دو تین آدمیوں کے بل پر چل رہا ہے، اُن کو میدان سے ہٹا دیا جائے گا تو جماعت ختم اور اس کی دعوت نسیاً منسیاً ہو جائے گی۔ اس غلط گمان کی بنا پر انہوں نے ایک غلط قدم اُٹھا دیا اور ٹھوکر کھائی۔ اب اگر انہوں نے خود اپنے اقدام کے نتائج کا جائزہ لیکر دیکھا ہوگا تو ان پر منکشف ہو چکا ہوگا کہ اس حرکت سے جو فوائد وہ اٹھانا چاہتے تھے ان میں سے کوئی فائدہ بھی نہیں حاصل نہیں ہو سکا ہے اور جن

نقصانات سے وہ بچنا چاہتے تھے وہ سب مع شیٔ زائد ان کو پہنچ گئے ہیں۔ اگرچہ میں ان حضرات کی عقل و دانش کے بارے میں کچھ بہت زیادہ خوش گمان نہیں ہوں، تاہم یہ توقع رکھتا ہوں کہ اس تجربے کے بعد وہ جماعت اسلامی اور اس کی تحریک کو، اور اُن بنیادوں کو جن پر یہ تحریک قائم ہے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے اور آئندہ کوئی قدم ناکافی معلومات اور سرسری اندازوں کی بنا پر نہ اٹھائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے جو محض کسی ایک شخص کی پکار پر یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی ہو۔ اس طرح کی ایک سطحی رائے قائم کر کے جو معاملہ بھی اس کے ساتھ پیدا کیا جائے گا وہ مفید نتیجہ پیدا نہ کرے گا۔ صحیح معاملہ، یا کم از کم معقول معاملہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پس منظر کو اور اس کی اصلیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

دراصل اس ملک میں دو مستقل مدارس فکر پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے۔ ہر ایک کو بہت سے اخلاقی، ذہنی اور تمدنی اسباب نے پرورش کیا ہے۔ ہر ایک کی جڑیں ہماری سوسائٹی میں دُور دُور تک پھیلی اور گہری جمی ہوئی ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ دُوسرے کو پھونک مار کر اُڑا دے۔

ایک مدرسۂ فکر وہ ہے جو مغرب کے سیاسی، علمی، اخلاقی اور معاشی غلبہ سے ہمارے اندر پیدا ہوا ہے۔ اس میں مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو عقیدہ و عمل دونوں میں اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور اس بات کو نہیں چھپاتے کہ انہیں اسلام کی پیروی منظور نہیں ہے۔ کچھ وہ ہیں جن کا انحراف تو قریب قریب اسی درجے کا ہے مگر سراسر منافقت اور مکاری کے ساتھ وہ اسلام کے ترجمان اور علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اسلام کو بالکل چھوڑ دینا تو نہیں چاہتے مگر پورے اور اصلی اسلام کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں بلکہ اپنے مذاق و رجحان کے مطابق ایک نیا اسلام بنانا چاہتے ہیں جس میں اصلی اسلام کی صرف وہ چیزیں باقی رہ سکتی ہیں جو ان کو پسند ہوں۔ ان مختلف رجحانات کے لوگوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر معیارِ حق وہ افکار، اقدار اور اطوار ہیں جو مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر انہوں نے اختیار کئے ہیں اور خدا و رسول کی ہدایت ان کے لئے حجت نہیں ہے کہ جو کچھ اُس سے ثابت ہو وہ اس کے آگے سر جھکا دیں۔ اس مدرسۂ فکر کے لوگ اگرچہ تھوڑے ہیں، اور ہمارے عوام کے ذہن و دماغ

ان کے ساتھ نہیں ہیں، لیکن زمام کار اس وقت انہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انگریزی اقتدار کے دور میں آگے بڑھنے کے جتنے مواقع بھی ملے زیادہ تر انہی کو ملے اور چلتے وقت انگریز نے اپنی میراث بھی اپنے اس خلف الصدق گروہ کو سونپی۔

دوسرا مدرسۂ فکر وہ ہے جو اسلام کی اندرونی قوتِ حیات کے نتیجے میں ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اگرچہ مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں جن کے درمیان جزئیات و فروع اور مذاقِ طبیعت کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہیں، مگر قدرِ مشترک ان سب کے درمیان یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کو اپنے لئے نظامِ زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں اور تمام معاملاتِ زندگی میں اس ہدایت کو حجت مانتے ہیں جو خدا و رسول سے ثابت ہو۔ یہ مدرسۂ فکر انگریزی اقتدار کے پورے دور میں مغلوب و مقہور رہا، نشوونما کے ذرائع سے محروم رہا، ہر شعبۂ زندگی میں زمامِ کار سے بے دخل رہا، اور اب بھی کم و بیش اس کا یہی حال ہے۔ لیکن اسلام کے وہ تمام اخلاقی و روحانی، دینی و فکری، اور تہذیبی و تمدنی اثرات، جن کی بدولت پچھلی تیرہ صدیوں میں ہر قسم کے مخالف حالات میں اسلام زندہ رہا ہے، اس مدرسۂ فکر کی پشت پر موجود ہیں۔ خود اس ملک کے اندر گذشتہ تین صدیوں سے تجدید و احیاءِ اسلام کی جو تحریکیں پے در پے اٹھتی رہی ہیں وہ سب اپنے طاقت ور اثرات کے ساتھ اس مدرسۂ فکر کی بنیاد مضبوط کر رہی ہیں۔ قوم کے متوسط اور اہل دماغ طبقے کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ قوم کے عوام اپنی جہالت و بے شعوری کے باوجود اس کے نصب العین سے متفق اور اس کے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اور اس پورے مدرسۂ فکر میں یہ جذبہ مشترک ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کی گاڑی اس رخ پر نہ جائے جدھر اسلام سے انحراف اور اسلام میں تحریف کرنے والے لوگ اسے لے جانا چاہتے ہیں، بلکہ اس کی سمت سفر خالص اسلام کی طرف موڑ دی جائے۔

جماعت اسلامی اسی دوسرے مدرسۂ فکر کی ایک شاخ ہے۔ اس کی دعوت کی تفصیلات اور اس کے طریق کار سے، یا اس کے کارکنوں سے اس زمرے کے لوگوں کو تھوڑے یا بہت اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہیں، لیکن اس کا مقام ہے اسی زمرہ میں۔ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے وہ ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دل کی آواز ہے جو اس ملک میں اسلام کا احیاء چاہتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہ اس مجموعی کوشش کا ایک جزء ہے جو یہاں تجدید اسلام کے لئے ہو رہی ہے۔ وہ کوئی درخت سے ٹوٹا ہوا پتہ نہیں ہے کہ آپ جب چاہیں اسے ایک پھونک مار کر اڑا دیں۔ وہ ایک بڑے درخت کی شاخ ہے جو اپنے تنے کے ساتھ وابستہ ہے اور زمین میں اپنی گہری اتری ہوئی

جڑوں کے ذریعہ سے غذا اور نشو ونما پا رہی ہے۔ اس طرح کی ایک تحریک کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس کے دو چار یا دس پانچ یا سب کارکنوں کو قید کر کے اس کا خاتمہ کیا جا سکے گا محض ایک خام خیالی ہے۔

عموماً اصحاب اقتدار اپنی مرضی کے خلاف کسی تحریک کو بڑھتے دیکھ کر اس کے خلاف جبر کے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک طرح کا جُوا ہے جو یہ لوگ کھیلتے ہیں۔ جبر لازماً ایک ہی نتیجہ پیدا نہیں کیا کرتا کہ آپ اطمینان سے آنکھیں بند کر کے اسے استعمال کر بیٹھیں اور خود بخود آپ کا مطلوب نتیجہ برآمد ہو جائے اس سے تو تین مختلف طریقے برآمد ہونے کے یکساں امکانات ہیں۔ ایک ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کے کارفرما اور کارکن دب جائیں یا بک جائیں۔ حکومت کے جُوا باز اسی نتیجہ کی امید پر یہ بازی کھیلتے ہیں۔ دوسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ جابرانہ مزاحمت سے تحریک اور زیادہ زور پکڑ جائے اور آزمائش کی بھٹی اس کے کارکنوں کی قابلیتوں کو اور زیادہ نکھار دے۔ اسی امید پر ایک تحریک جبر کا خیر مقدم کرتی ہے اور بسا اوقات اس کو خود دعوت دینے لگتی ہے۔ تیسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک غلط راستے پر پڑ جائے، اس کے لیڈر اور کارکن اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھیں، یا ذمہ دار لیڈروں کے ہٹ جانے کے بعد تحریک غیر ذمہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے، یا آئینی و جمہوری طرز کی جدوجہد کا راستہ بند پا کر وہ خفیہ تحریکوں کا راستہ اختیار کرے۔ یہ نتیجہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہے، نہ حکومت کے لئے، نہ ملک کے لئے، نہ خود تحریک کے لئے۔ دنیا میں بارہا جبر کے استعمال سے یہ نتیجہ رونما ہو چکا ہے۔ اس کی بدولت اچھی اچھی مفید تحریکیں بگڑ کر نقصان دہ بن گئی ہیں۔ اس نے ملکوں اور قوموں کی قسمتیں بگاڑ دی ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے سامنے روس موجود ہے جہاں زاروں کے جبر نے اصلاح کے جمہوری و آئینی طریقوں کا راستہ روک کر اصلاح طلب لوگوں کو خفیہ تحریکات کے راستے پر ڈال دیا اور اس کی بدولت پوری قوم کا مزاج ایسا بگڑ گیا کہ آج ساری دنیا اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ حکومتیں اس امید پر جبر کے ہتھیار استعمال کرتی ہیں کہ یہ نتیجہ رونما نہ ہوگا۔ مگر اس کے رونما نہ ہو سکنے کی ضمانت کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

الحمد للہ کہ ہم اپنے معاملہ میں پہلے نتیجہ کا کوئی خوف نہیں رکھتے، اور خدا کے فضل سے دوسرے نتیجے کی امید رکھتے ہیں۔ لیکن تیسرے نتیجے کا امکان، چاہے وہ کتنا ہی بعید ہو، ایک قابلِ حذر چیز ہے۔ اس وجہ سے میں نے

اپنی گرفتاری سے پہلے بھی یہ کہا تھا اور اب اظہار خیال کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر کہتا ہوں کہ حکومت کو اس قماربازی سے باز رہنا چاہئے اور سیدھی طرح کام کرنیوالوں کے ساتھ سیدھی طرح ہی معاملہ کرنا چاہئے۔ ملک کی اور خود حکومت کی اپنی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ یہاں ہر خیال کے لوگوں کیلئے رائے عام سے اپیل کرنے کا موقع کھلا رہے اور صرف رائے عام کی تبدیلی نظام حکومت کی تبدیلی کیلئے کافی ہو۔ بخلاف اس کے ایسے حالات پیدا کر دینا جن میں ایک مدرسۂ فکر غالب آ کر دوسرے مدارس فکر کا گلا گھونٹے اور نظامِ حکومت کی تبدیلی کیلئے رائے عام کو تیار کرنے کے بجائے دوسرے طریقوں کا استعمال ناگزیر ہو جائے کبھی کسی ملک کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہوا ہے اور ہمارے اس ملک کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ایسے حالات پیدا کرتے ہیں وہ ملک کے حق میں بھی کانٹے بوتے ہیں اور خود اپنے حق میں بھی۔ ہم نے اب تک جو کام کیا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں وہ سراسر آئینی ہے، پر امن ہے اور علانیہ ہے۔ جو اصلاح ہمارے پیش نظر ہے اس کیلئے ہم نے اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہ اختیار کیا ہے نہ آئندہ کریں گے کہ اپنے خیالات عوام الناس کے سامنے پیش کریں، اور جو لوگ ہمارے ہم خیال بن جائیں ان کو منظم کریں۔ ملک کے نظام زندگی میں تغیر پیدا کرنے کی صحیح صورت ہمارے نزدیک صرف یہی ہے اسی کی کوشش ہم کرتے رہے ہیں اور آگے کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں خواہ وہ برسرِ اقتدار ہوں یا نہ ہوں، ان کیلئے سیدھا اور صاف طریق کار یہ ہے کہ وہ دلائل سے ہمارا مقابلہ کریں اور جس طرح رائے عام سے ہم اپیل کر رہے ہیں وہ بھی کریں۔ ہم اس کیلئے تیار ہیں اور انہیں بھی اس کیلئے تیار ہونا چاہئے کہ باشندگان ملک کی اکثریت اس کھلے مقابلے میں جس مدرسۂ فکر کو پسند کرے وہ زمام کار پر قابض ہو اور دوسرے مدارس فکر عوام کی پسندیدگی حاصل کرنے کیلئے کوشش کرتے رہیں اس سیدھے طریقے کو چھوڑ کر جو لوگ دوسروں کا راستہ روکنے کیلئے جبر و ظلم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور حکومت کے وسائل و ذرائع اور اختیارات اس غرض کیلئے استعمال کرتے ہیں کہ رائے عام پر ان کا دائمی قبضہ قائم رہے اور دوسروں کو اسے ہموار کرنے کا موقع مل ہی نہ سکے، وہ نادان اور ناعاقبت اندیش ہیں۔ ان کا یہ طریقہ نہ صرف حکمت و مصلحت کے خلاف ہے، بلکہ دیانت و امانت کے خلاف بھی ہے، کیونکہ پبلک نے حکومت کے اختیارات اس کام کے لئے انکے حوالہ نہیں کئے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ طریقہ اخلاقی بزدلی اور ذہنی کمزوری کی کھلی علامت ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے دلائل اور عملی کام کے زور سے رائے عام کو جیتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے اوچھے ہتھیاروں سے کام لے رہے ہیں۔

جماعت اسلامی نے ہماری گرفتاری کے بعد اور ہماری قید کے دوران میں جو رویہ اختیار کیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس جماعت کا مزاج اب پختہ ہو چکا ہے اور اس کے کارکنوں میں بالعموم وہ اخلاقی و ذہنی اوصاف پیدا ہو چکے ہیں جو اس کام کے لیے مطلوب ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی اشتعال اور بغیر کسی بزدلی اور مرعوبیت کے اپنا کام اسی طرح جاری رکھا جس طرح وہ پہلے سے کر رہے تھے، بلکہ اپنے مقصد کے لئے ان کی جدوجہد پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ یہ ہمارے اصلی طریق کار کے عین مطابق تھا اور حکومت کی زیادتی کا صحیح جواب بھی یہی ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ رہنماؤں کی گرفتاری جماعتوں پر نہایت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ کسی کے کارکنوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ کسی کے کارکن مشتعل ہو کر غلط کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ کسی کے کارکن اپنا اصل کام چھوڑ کر اپنے رہنماؤں کو چھڑانے میں ساری قوتیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے مقصد کے بجائے اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لئے حکومت نے ان کے رہنماؤں کو گرفتار کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ جماعت اسلامی اس قسم کے تمام بُرے اثرات سے محفوظ رہی، بلکہ نقصان اٹھانے کے بجائے اس نے اپنے رہنماؤں کی قید سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے سینکڑوں کارکن پہلے سے زیادہ سرگرم اور مستعد ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ہماری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر محسوس کیا اور اسے سنبھالا۔ انہوں نے جماعت کی دعوت کو ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیا، انہوں نے اندرون ملک کے دیہات تک کو اپنے مدعا سے روشناس کرا دیا۔ انہوں نے ہماری رہائی کے لئے بھی اگر کوئی کوشش کی تو اس طرح کی کہ ساتھ ساتھ ہماری دعوت کی اشاعت بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس آزمائش کے مرحلے سے جماعت پوری طرح کامیاب ہو کر نکلی ہے۔ اس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور رفقاء جماعت کو صمیم قلب سے مبارکباد دیتے ہیں۔

چند کلمات اس رسالے کے متعلق بھی مجھے عرض کرنے ہیں۔

میری مصروفیتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور قوت کار کم ہو رہی ہے۔ میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ میرے لئے زیادہ دیر تک اس رسالے کو تنہا چلانا مشکل ہے۔ تمنا تھی کہ میرے نوجوان رفیقوں میں سے کوئی اس بوجھ کو سنبھالنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اب جیل سے باہر آ کر معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں نعیم صاحب نے بہت خوبی کے ساتھ میری جانشینی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ سہارا مل جانے کے بعد میرے کندھے اتنے ہوتے ہوئے کہ پھر اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہیں

(بقیہ بر صفحہ ۲۹۲)

(بقیہ اشارات)

میں خود جو کچھ لکھ سکتا ہوں ان شاء اللہ ضرور لکھتا رہوں گا۔ تفہیم القرآن کا سلسلہ بھی آئندہ اشاعت سے از سرِ نو شروع کر دوں گا۔ لیکن پرچے کو مرتب کرنے کی ذمہ داری حسبِ سابق نعیم صاحب ہی کے سپرد رہے گی۔

دوسری ضروری گزارش پرچے کی قیمت کے بارے میں ہے۔ پچھلے چند سال میں ہر چیز کی قیمتیں چڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہیں۔ اسبابِ اشاعت اور اسبابِ زندگی، دونوں ہی حد سے زیادہ گراں ہو چکے ہیں۔ میں نے اب تک سخت سے سخت حالات میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ پرچے کی قیمت نہ بڑھائی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے خرید سکیں۔ لیکن اب مسلسل نقصان کے ساتھ اس پرچے کو زندہ رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے مجبوراً ماہِ شعبان سے سالانہ قیمت میں ایک روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ حالات کی یہ سختی دور ہو جائے اور ہم پھر پچھلی قیمت کی طرف عود کر سکیں۔